قرآن کی ایک تشبیہ

جناب محمد رفیق چودھری صاحب

قرآن حکیم نے اپنی دعوت کو انتہائی فصیح و بلیغ انداز میں پیش کرنے کے لیے بہت سے ادبی محاسن ـــــ تشبیہ، استعارہ، تمثیل، کنایہ، تجنیس، مجاز مرسل، لف و نشر اور مراعات النظیر وغیرہ ـــــ سے خوب کام لیا ہے۔ اِس پہلو سے قرآن مجید کے اسالیبِ بیان میں وہ اعجاز موجود ہے جس کی نظیر پیش کرنے سے کلامِ انسانی قاصر ہے۔

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ۝ (بنی اسرائیل ۸۸)

(اے نبیؐ) تم کہو کہ اگر سارے انسان اور جن اس بات کے لیے جمع ہو جائیں کہ اس جیسا قرآن لے آئیں تو اس جیسا نہ لا سکیں گے خواہ ایک دوسرے کے مددگار بھی بن جائیں۔

سورۂ بقرہ میں قومِ بنی اسرائیل کی داستانِ عبرت کے ضمن میں ایک ایسی ہی بلیغ تشبیہ دی گئی ہے جس سے بڑھ کر کسی تشبیہ کی بلاغت کا تصور مشکل ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے کہ:

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ

پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے گویا کہ وہ پتھر ہیں یا اُن سے بھی

اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ (البقرہ ۔ ۷۴)	سخت تر ۔ اور بعض پتھر تو ایسے ہیں کہ اُن سے پانی کے چشمے پھوٹ نکلتے ہیں ۔ اور بعض ایسے کہ جب پھٹتے ہیں تو ان میں سے پانی بہنے لگتا ہے اور بعض ایسے کہ خوفِ الٰہی سے گر پڑتے ہیں ۔ اور اللہ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں ہے ۔

اہم الفاظ کی تحقیق | اس تشبیہ کو سمجھنے کے لیے قَسَتْ، قُلُوْبُكُمْ اور اَلْحِجَارَة کے اہم الفاظ کی تحقیق اور تشریح ضروری ہے :-

قَسَتْ : قَسَا ، يَقْسُوْ ، قَسْوَةً سے واحد مؤنث غائب کا صیغہ ہے ۔ "قَسَا" کے معنی ہیں صلب ، غلظ ۔ یعنی سخت ہونا ، ٹھوس بن جانا ، درشت ہونا ، سکڑنا ، منجمد ہونا ، اس لفظ کے مادے ـــ ق س و ـــ میں سختی ، قوت ، اجتماع اور صلابت کا مفہوم پایا جاتا ہے ۔ سنگدلی کو قَسْوَةُ الْقَلْبِ کہتے ہیں ۔ ایسی سخت زمین جس میں کچھ نہ اُگے ، اَرْضٌ قَاسِيَةٌ[1] کہلاتی ہے ۔ انتہائی سنگدل شخص کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ هُوَ اَقْسٰى مِنَ الصَّخْرِ[2] (وہ پتھر سے بھی زیادہ سخت ہے) ۔ حَجَرٌ قَاسٍ[3] سخت اور ٹھوس پتھر کو اور لَيْلَةٌ قَاسِيَةٌ سخت اندھیری رات کو کہتے ہیں ۔ قَسَا قَلْبُهٗ ، اے صلب و غلظ[4] (اس کا دل سخت ہو گیا) ۔

ابن ابی اُمیہ کا شعر ہے ؎

اطرافه تعقد من لينه وقلبه كالحجر القاسي

اس کی آنکھیں اُس کی نرمی کے سبب سے بندھی ہوتی ہیں ، اور اس کا دل سخت پتھر کی طرح ہے ۔

---

[1] اقرب الموارد [2] الاساس [3] لسان العرب [4] اقرب الموارد

قُلُوْبُكُمْ: قلوب قلب کی جمع ہے اور کُمْ ضمیر مجرور متصل ہے، صیغہ جمع حاضر مذکر ہے۔

عربی میں قلب (بطورِ مصدر) کے تین بنیادی مفہوم ہیں۔

۱۔ کسی چیز کا ایک رُخ سے دوسرے رُخ پر پھرنا:۔ قَلَبَهٗ کے معنی ہیں: حَوَّلَهٗ عن وجهه[1] (اس نے اس کا رُخ پھیر دیا)، رَدَّهٗ من جهة الی جهةٍ[2] (اس نے اسے ایک رُخ سے دوسرے رُخ موڑ دیا)۔

قرآنِ مجید میں ہے کہ:

قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِی السَّمَآءِ (البقرہ - ۱۴۴) (اے نبیؐ) ہم دیکھتے ہیں تمہارے چہرے کا بار بار آسمان کی طرف پھرنا۔

۲۔ ہر خالص شے: عربی میں خالص عربی النسل شخص کو عربیٌ قلبٌ کہتے ہیں۔ صحیح النسب شخص کو رجلٌ قلبٌ کہا جاتا ہے۔

۳۔ کسی چیز کا بہترین اور گرانقدر حصّہ: کھجور کے درخت کے گابھے کو قلبُ النخلة کہتے ہیں، کیونکہ وہ اس کا مغز اور جوہر ہوتا ہے۔ قلب الجیش لشکر کے درمیانی حصّے کو کہا جاتا ہے کیونکہ وہ سپہ سالار کا مقام و مرکز ہوتا ہے۔ اسی طرح انسان کے دل کو بھی قلب کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ انسانی جسم میں بہترین حصّہ ہے۔ عربی میں دل کے لیے فُؤَاد کا لفظ بھی مستعمل ہے۔ لیکن قلب اس سے زیادہ وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور اس کا اطلاق عقل و شعور پر بھی ہوتا ہے، کیونکہ عقل و شعور انسان کا قیمتی جوہر ہے۔ انگریزی زبان میں (MIND) کا لفظ اسی مفہوم کا حامل ہے۔

خود قرآن مجید میں بھی قلب کا لفظ عقل و شعور کے معنوں میں آیا ہے۔ سورۂ قٓ

---

[1] اقرب الموارد

[2] ابن فارس

آیت ۳۷ میں ہے کہ:

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی	بے شک اس واقعے میں بڑی عبرت ہے
لِمَنْ کَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَی	ہر اُس شخص کے لیے جس کے پاس دل ہو
السَّمْعَ وَهُوَ شَهِیْدٌ۔	یا وہ متوجہ ہو کر کان ہی لگا دے۔

اِسی طرح سورۂ اعراف کی آیت ۱۷۹ میں یہ الفاظ آئے ہیں:

لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ بِهَا اُن کے دل ہیں، مگر وہ سمجھتے نہیں۔

ایک اور مقام پر سورۂ حج آیت ۴۶ میں آیا ہے کہ:

اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ	کیا انہوں نے زمین میں سیر نہیں
فَتَکُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ یَّعْقِلُوْنَ	کی تاکہ ان کے دل سوچتے
بِهَا۔	سمجھتے۔

الحجارۃ۔ یہ حجرٌ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں "پتھر"۔ عربی زبان میں مصدر حجر حا کی تینوں حرکات سے آتا ہے اور اس کے معنی المنع کے ہوتے ہیں یعنی منع کرنا، روکنا، حفاظت کرنا۔ جن عربی الفاظ کے مادّہ اصلیہ میں حا اور جیم جمع ہوں، ان میں بالعموم روکنے اور منع کرنے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ حجب، حج اور حجز تینوں میں روکنے اور منع کرنے کے معنی پائے جاتے ہیں۔ امام راغبؒ کے نزدیک سورۂ بقرہ آیت ۲۶ کے الفاظ۔

وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ اس دوزخ کی آگ کا ایندھن ہیں آدمی اور پتھر

یہاں الحجارہ سے مراد وہ لوگ ہیں جو دعوتِ حق کو قبول کرنے میں پتھروں کی طرح سنگ دل واقع ہوئے ہیں۔

عربی زبان میں پتھر کے لیے جس قدر الفاظ موجود ہیں ان سب میں سختی، شدّت، بے حسی، روک اور پائیداری و استواری کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ گویا پتھر کے مفہوم کی تعبیر یہ ہے کہ وہ سخت اور شدید ہے، بے حس و حرکت ہے۔ جذبے، تاثر اور احساس سے یکسر عاری ہے اور خارجی عوامل سے بہت کم اثر پذیر ہوتا ہے۔

پتھر کی اسی تعبیر کو عربی ادب میں اختیار کیا گیا ہے۔ عمرو بن ملقط الطائی کا

شعر ہے:

وحوادث الایام لا یبقیٰ لھا الا الحجارۃ

(اور زمانے کے حوادث تو زمانے کے لیے پتھروں کے سوا کچھ نہیں چھوڑتے)

سلم بن عمرو بن عطار کہتا ہے:

یلین ما لا اُرید رقّتہ وقلب من اشتھیہ کالحجر

(میں جس کی نرمی نہیں چاہتا وہ نرم ہوتا ہے اور جسے میں چاہتا ہوں اُس کا دل پتھر کی طرح ہے)۔

پتھر کی یہی تعبیرات ادبیاتِ عالم میں موجود ہیں۔ اُردو ادب میں بھی اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ غالب کہتا ہے:

دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

علامہ اقبال کا شعر ہے:

آزاد کی رگ سخت ہے مانندِ رگِ سنگ
محکوم کی رگ نرم ہے مانندِ رگِ تاک

قساوتِ قلبی کیا ہے؟ آیت زیرِ نظر میں جس "قساوتِ قلبی" کا ذکر ہے۔ اس کی حقیقت

کیا ہے ؟

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جس قدر ذہنی اور جسمانی صلاحیتیں عطا کی ہیں، اُن میں ایک قدرِ مشترک یہ بھی ہے کہ اگر ان میں سے کوئی صلاحیت استعمال میں نہ لائی جائے یا اُسے بے محل استعمال کیا جائے تو وہ بتدریج کم ہو کر بالآخر معدوم ہو جاتی ہے۔ یہی حال انسان کے فہم و تدبر کی اُس صلاحیت کا ہے، جو حقائق و واقعات کو سمجھتی اور ان سے تاثر لیتی ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص کسی امر واقعہ اور قولِ حق سے مسلسل اعراض و انکار کا رویہ اختیار کرے تو ایک وقت آتا ہے جب اس کے دل میں اس حقیقت اور سچائی کے خلاف ایک ضد اور چڑ سی پیدا ہو جاتی ہے۔ جو آگے چل کر تنفر اور ہٹ دھرمی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ پھر نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ فہم و تدبر کی وہ صلاحیت بالکل ٹھٹھر کر رہ جاتی ہے۔ قساوتِ قلبی کی وجہ سے انسان فہم و تدبر کی صلاحیت سے محروم ہو کر امرِ حق کی تکذیب کرنے پہ اڑ جاتا ہے۔ پھر ایسے شخص کو دوپہر کی تیز دھوپ میں سورج تو نظر نہیں آتا، مگر ماہ و پروین ضرور نظر آجاتے ہیں ؎

اگر شاہ روز را گوید شب است ایں
بباید گفت اینک ماہ و پروین

ساری دُنیا کے لیے دو اور دو کا مجموعہ چار ہوتا ہے، مگر ایسے شخص کے لیے دو اور دو کبھی تین اور کبھی پانچ ہوتے ہیں۔

قرآنِ حکیم نے دعوتِ حق کی مخالفت کرنے والوں کو ایک جگہ جانوروں سے تشبیہ دی ہے، بلکہ اُن کو جانوروں سے بھی فروتر قرار دیا ہے۔

اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ (الاعراف - ۱۷۹)	وہ تو جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گذرے!

ایک دوسرے مقام پہ دعوتِ حق کو نہ سننے اور اس سے اعراض کرنے والے شخص کو "مردہ اور بے جان" کہا ہے۔ سورہ رُوم آیت نمبر ۵۲ میں ہے کہ:

فَاِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى	پس (اے نبیؐ) تم اپنی دعوت ان مُردوں کو

وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ تو نہیں سنا سکتے اور نہ ان بہروں کو جبکہ
اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ۝ وہ پیٹھ پھیر کر چل دیں۔

گویا مخالفینِ حق چلتے پھرتے لاشے ہیں جن میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں رہتی۔ بقول حفیظ جالندھری ؎

چلتے پھرتے ہوئے لاشوں سے ملاقاتیں ہیں
زندگی کشف و کرامات نظر آتی ہے

قرآنِ حکیم ان کور ذوقوں اور عقل کے اندھوں کی کیفیات یوں بیان کرتا ہے کہ "اُن کے دلوں پر مہر لگا دی گئی"، "اُن کے دل سخت ہو گئے"، "اُن کے دل اندھے ہو گئے"، "اُن کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہے"، "اُن کے دل ٹیڑھے ہو گئے"، "اُن کے دلوں پر قفل چڑھے ہوئے ہیں"، "اُن کے دل زنگ آلود ہو گئے ہیں"، "اُن کے دل غافل ہیں" وغیرہ ذالک۔

قرآن حکیم کی یہ ساری تعبیریں اپنے لفظی اختلاف کے باوصف معنوی طور پر ایک ہی مفہوم دکھتی ہیں۔ جو لوگ دعوتِ حق کے جواب میں غور و فکر سے کام نہیں لیتے اور اُن کا یہ عدمِ تفکر مسلسل جاری رہتا ہے تو ایک وقت آتا ہے جب غور و تفکر کی صلاحیت ہی ختم ہو جاتی ہے اور قبولِ حق کی استعداد ہی باقی نہیں رہتی۔

البتہ قرآنِ حکیم نے اس صورتِ واقعہ کو کبھی انسان کی طرف منسوب کیا ہے اور کبھی اللہ تعالیٰ کی جانب۔ قرآنِ حکیم نے انسان کو اس حالت کا ذمہ دار اور جوابدہ اس لیے ٹھہرایا ہے کہ اسے بہر حال اللہ تعالیٰ نے ارادے اور اختیار کی آزادی دے رکھی ہے جسے وہ نیکی اور بدی دونوں راہوں پر چلنے کے لیے آزادانہ طور پر استعمال کر سکتا ہے اور اسی شعوری انتخاب اور آزادانہ ارادے کے نتیجے میں نیکی اور بدی کے لحاظ سے ہر انسان جزا و سزا کا مستحق قرار پاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں بعض اوقات انسانی اعمال کو اللہ تعالیٰ کی جانب منسوب کیا گیا ہے کہ انسان باوجود اپنے آزاد ارادے کے اپنی خواہشات اور تمناؤں کو از خود عملی جامہ نہیں پہنا سکتا اور عمل کی ساری توفیق صرف اللہ تعالیٰ ہی عطا کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں اعمالِ انسانی کو انسان اور خدا دونوں کی طرف منسوب کرنے کی مثالیں موجود ہیں۔

اِس مقام پر قساوتِ قلبی سے متعلق چند آیاتِ قرآنی کے حوالے دیں گے، جن سے یہی حقیقت پوری طرح واضح ہو جائے گی۔

سورۂ مائدہ آیت ۱۳ میں ہے کہ:

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۔

اُن (بنی اسرائیل) کے عہد توڑنے کی وجہ سے ہم نے ان کو اپنی رحمت سے محروم کر دیا اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا۔

گویا پہلے تو بنی اسرائیل نے اللہ سے باندھے ہوئے پختہ عہد کو توڑنے کا جرم کیا۔ نتیجۃً اللہ تعالیٰ کے قانونِ عدل نے ان پر اپنی رحمت و ہدایت کے دروازے بند کر دیئے۔

سورۂ صف آیت ۵ میں ہے کہ:

فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ؕ

جب اُنھوں نے کج روی اختیار کی تو اللہ نے بھی اُن کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا۔

گویا کج روی کے مرتکبین کے لیے راہ حق مسدود کر دی گئی۔

اسی طرح سورۂ نساء آیت ۱۵۵ میں ہے کہ:

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۔

اُن (بنی اسرائیل) کی طرف سے عہد توڑنے، اللہ کی توفیق سے انکار کرنے، نبیوں کو ناحق قتل کرنے، اور ان کے اس قول کہ "ہمارے دل محفوظ ہیں" کے بعد اللہ نے اُن کے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر لگا دی۔ پس ان میں سے بہت ایمان لائیں گے۔

مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل کی مسلسل عہد شکنی، اُن کی طرف سے آیاتِ الٰہی کا انکار، ان کا انبیاءِ کرام کو قتل کر ڈالنا اور اُن کا "ملفوف دلی" کے غرّے میں آنا، ایسے بڑے جرائم تھے، جن کی پاداش میں اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر ایسی مہر لگا دی کہ اب ان کے لیے دولتِ ایمان سے بہرہ ور ہونا ممکن نہیں رہا۔ اسی طرح سورۂ منافقون آیت ۳ میں ہے کہ:

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝

یہ لوگ حقیقتِ ایمان کو پا لینے کے بعد اس سے روگردان ہوئے۔ اس جرم کے نتیجے میں اللہ نے اُن کے دلوں پہ مہر لگا دی اور ان سے غور و فکر کی صلاحیت سلب کر لی۔

اور سورہ حدید آیت ۱۶ میں ہے کہ:

فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ۔

اہل کتاب پر ایک عرصہ تک نافرمانی کرتے رہے اور پھر ان کے دل سخت ہو گئے۔

اور سورۂ مطففین آیت ۱۴ میں ہے کہ:

كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝

ہرگز ایسا نہیں، بلکہ اُن کے اپنے کسب کی وجہ سے ان کے دل زنگ آلود کر دیئے گئے۔

مطلب یہ ہے کہ اُن کے پے در پے بُرے اعمال کی سیاہی اُن کے دلوں پہ چھا گئی ہے۔ اب ان دلوں کو نیکی کی شمع سے منوّر ہونا نصیب نہیں۔

ایسی قساوتِ قلبی کو ایک حدیث میں "اللہ سے دُوری" کہا گیا ہے۔ اور اس کا سبب وہ کثرتِ کلام ہے جو یادِ الٰہی سے خالی ہو۔ جامع ترمذی میں ہے کہ:

عن ابن عمر قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا تكثروا الكلام بغير ذكر الله فان كثرة الكلام بغير ذكر الله قسوة للقلب، وان ابعد الناس من الله القلب القاسي۔

ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ایسی زیادہ گفتگو نہ کرو جو اللہ کی یاد سے خالی ہو۔ کیونکہ اللہ کی یاد سے خالی گفتگو کی زیادتی دل کو سخت بنا دیتی ہے اور اللہ (کی رحمت) سے دُور ترین شخص وہ ہے جس کا دل سخت ہو۔

ایک اور حدیث میں نہایت بلیغ انداز میں "دل کے اِس زنگار" کی پوری کیفیت

بیان ہوئی ہے۔

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان المؤمن اذا اذنب کانت نکتۃ سوداء فی قلبہ فان تاب ونزع و استعتب صقل قلبہ و ان زادت حتی تعلو قلبہ فذلک الران الذی قال اللہ تعالیٰ: كَلَّا بَلْ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِم مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۝ (رواہ احمد، ترمذی، ابن ماجہ)

ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب مومن کوئی گناہ کر بیٹھتا ہے تو اس کے سبب سے اس کے دل پر ایک سیاہ دھبہ پڑ جاتا ہے۔ پھر اگر وہ توبہ کر لیتا ہے اور اس گناہ سے باز آجاتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لیتا ہے تو اس کے دل کا وہ دھبہ صاف ہو جاتا ہے اور اگر اس کے گناہوں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اُن کی سیاہی اُس کے پورے دل پر چھا جاتی ہے تو یہی وہ رَین یعنی زنگ ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے کہ "ہرگز نہیں، بلکہ ان کے دلوں پر اُن کے اعمال کی سیاہی چھا گئی ہے"۔

یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم میں راسخ العلم اور اہلِ بصیرت کی زبانوں پر جو دُعا جاری ہوئی ہے اُس میں ہدایت یافتہ دلوں کی سلامتی اور راہ ہدایت پر قائم رہنے کی طلب کی گئی ہے۔ اور انہیں کج روی سے بچانے کی استدعا کی گئی ہے۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا...... (آل عمران آیت ۸)

اے ہمارے پروردگار ہدایت عطا ہونے کے بعد ایسا ہو کہ ہمارے دلوں میں کجی اور ٹیڑھ پیدا نہ ہو۔

اسی طرح صحیح مسلم میں حضرت زید بن ارقمؓ کی وہ روایت ہے، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے دل سے پناہ مانگی ہے جس میں خشیت اور انابت الی اللہ نہ ہو۔

...... اَللّٰھُمَّ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِکَ — اے اللہ! میں تیری پناہ چاہتا ہوں
مِنْ قَلْبٍ لَّا تَخْشَعُ ...... — ایسے دل سے جس میں خوفِ خدا نہ ہو۔

اب ذرا زیرِ بحث آیت میں قومِ بنی اسرائیل کے دلوں کی جس سختی کا ذکر ہوا ہے۔ اُس کی تفصیل یہ ہے کہ یہ قوم یعقوب علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک پورے ڈھائی ہزار برس کے عرصے میں انبیاء کرام کی دعوتِ حق سے مسلسل انحراف کرتی رہی۔ اسے اللہ تعالیٰ نے وہ نعمتیں عطا کی تھیں جو کسی اور قوم کے حصے میں نہیں آئیں۔ اسے لشکرِ فرعون سے بچانے کے لیے بحرِ قلزم کا سینہ چھلنی کیا گیا۔ صحرائے سینا کی چلچلاتی دھوپ میں اس کی خاطر بادلوں کے سائبان تانے گئے۔ اس کی غوراک اور طعام کے لیے مَن و سلویٰ کا دسترخوان بچھایا گیا۔ اس کی پیاس بجھانے کے لیے پتھر کی چٹانوں سے پانی کے چشمے نکالے گئے، اس کی ہدایت کے لیے الواحِ توریت نازل کی گئیں، اس کی رہنمائی کے لیے پے درپے انبیاء کرام مبعوث کیے گئے۔

مگر ان تمام تر انعاماتِ الٰہیہ کے باوجود ان لوگوں کا رویّہ کیا رہا؟

یہ لوگ فراعنۂ مصر کی غلامی سے نجات پانے کے فوراً بعد بُت پرستی کی طرف جھک گئے انہوں نے موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے کے لیے اللہ تعالیٰ کو بچشمِ سر دیکھنے کی شرط لگائی۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کو ایک گائے ذبح کرنے کا حکم دیا تو اُن کی زبانیں سوال در سوال کے لیے کُھل گئیں۔ انہوں نے سامری کے ایک اشارے پر گائے کی پرستش کرنی شروع کر دی، مگر ہارون علیہ السلام کی دعوتِ توحید پر کوئی کان نہ دھرا۔ انہوں نے حدود اللہ کو توڑا اور حلال و حرام کی تمیز مِٹا دی۔ خدا کی کتاب توریت میں من مانی تحریفیں کر ڈالیں ـــــ یومُ السبت یعنی ہفتے کے بارے میں حکمِ الٰہی کی خلاف ورزی کی اور شریعتِ الٰہیہ میں حیلہ سازی کی بدعت ایجاد کی۔ انہوں نے ہدایتِ الٰہی سے منہ موڑا اور جادوگری کا ارتکاب کیا۔ اللہ تعالیٰ کے فرستادہ نبیوں کو مشقِ ستم بنایا اور ان میں سے بعض کو قتل بھی کر ڈالا۔ خوفِ الٰہی کے بجائے ان کے دلوں پر خوفِ مرگ طاری ہوا۔ اُنہوں نے دُنیا پرستی اور آخرت فراموشی اختیار کی۔ اپنے آپ کو اس غرّے میں مبتلا کیا کہ جنت میں سوائے اُن کے کوئی اور داخل نہ

ہو سکے گا - رہا دوزخ کا عذاب تو وہ اُن کے بڑے سے بڑے مجرم کے لیے بھی چند روز سے زیادہ مدت کے لیے نہیں ہوگا - اس قوم نے "یہودیت" ہی کو معیارِ ہدایت قرار دے کر تمام غیر یہودیوں کو گمراہ کیا - اور انبیاء علیہم السلام اور اہلِ حق کی ہر دعوت کا جواب " قُلُوْبُنَا غُلْفٌ " (ہمارے دل تو محفوظ ہیں) کے منفی انداز میں دیا -

بنی اسرائیل کے یہی وہ جرائم تھے جن کے مسلسل ارتکاب نے اُن کے دلوں کو سخت کر دیا تھا - کسی کی طرف سے معمولی ہمدردی اور تحفے پر ہر انسان کی گردن جذبۂ شکر و امتنان سے جھک جاتی ہے - مگر یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتوں اور بے مثال بخشائشوں سے متمتع ہونے کے باوجود ناقدری اور ناشکری کی تصویر بنے رہے - وہ کلامِ الٰہی جو اگر پہاڑوں پر نازل ہو جاتا تو وہ بھی خشیتِ الٰہی سے پھٹ جاتے اور ریزہ ریزہ ہو جاتے - مگر ان لوگوں کے اصنامِ قلوب کو نرم و گداز اور متاثر نہ کر سکا - بلکہ اُلٹا اس سے اُن کے دل مزید سخت ہو گئے - اور اتنے سخت کہ پتھر بھی اُن کے آگے ہیچ ٹھہرے - پتھروں میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ ان سے پانی کے چشمے بہہ نکلیں، وہ اگر ٹوٹ جائیں تو اُن سے پانی بہنے لگے، وہ بلندی سے گر کر بھی اپنی ہستی کا ثبوت دے سکتے ہیں، مگر یہ لوگ بالکل مُردہ ہو چکے تھے، زندہ نہ تھے - اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَاءٍ -

غور کیجیے، قرآن حکیم نے ان لوگوں کے دلوں کو کس سے تشبیہ دی اور پھر اس سے کس طرح کا تاثر پیدا کر دیا - فرمایا: ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ کہ پھر ان تمام آیات و معجزات کے مشاہدے کے بعد بھی تمہارے دل نرم پڑنے کی بجائے سخت ہو گئے - دلوں کی سختی کو پتھروں سے تشبیہ دی اور اس میں تشبیہ کے ادات و ارکان بیان کر دیئے - هِيَ (قُلُوْبُكُمْ) یہاں پر مشبّہ ہے اور اَلْحِجَارَةُ مشبہ بہ، قساوت وجہ شبہ، كَ (کاف) حرف تشبیہ اور قساوتِ قلبی غرضِ تشبیہ ہے - اس کے ساتھ ہی قرآن مجید نے مزید فرمایا کہ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً (بلکہ اُن سے بھی سخت تر) گویا بنی اسرائیل کے دلوں کی سختی پتھروں کی سختی کے برابر نہ رہی بلکہ اُن سے بھی زیادہ ہو گئی - ان قرآنی الفاظ کے ایک اور معنی کے لحاظ سے اُن کے دل پتھر سے بھی زیادہ سخت چیز

مثلاً لوہے وغیرہ کی طرح سخت ہو گئے — بہر حال ان دونوں مطالب میں سے ہر ایک نے پتھر کی مذکورہ تشبیہ کے تاثر کو دو آتشہ کر دیا ہے۔

اس کے بعد قرآن مجید نے پتھروں اور چٹانوں کے بعض خواص بھی بیان کر دیئے کہ وہ اپنی سختی اور صلابت کے باوجود کچھ "نرم گوشے" بھی رکھتے ہیں۔ ان کی پہلی خصوصیت یہ بیان کی کہ يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْأَنْهَارُ۔ یعنی اُن سے پانی کے چشمے اُبل پڑتے ہیں۔ کوہستانی علاقوں میں یہ چیز عام مشاہدے میں آتی ہے کہ پہاڑوں کی بلند چوٹیوں پر سنگلاخ چٹانوں کے اندر سے فوارے کی مانند اُچھلتا ہوا پانی نظر آتا ہے۔ پھر پتھروں کے بیچوں بیچ اپنے لیے راہ نکالتا ہوا دامنِ کوہسار میں ندی کی صورت میں بہتا ہے۔

دوسری خاصیت یہ مذکور ہوئی کہ انہی پتھروں میں نرم و گداز ہونے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاءُ۔ یعنی کبھی کبھی وہ پتھر ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں اور ان سے پانی نکل آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب کبھی پتھروں میں شگاف پڑ جاتے ہیں یا ان میں کسی طرح کوئی سوراخ یا دراڑ پیدا ہو جاتی ہے تو اُن کے اندر سے اندر پانی رِس رِس کر باہر نکل آتا ہے۔

پھر انہی پتھروں کے بارے میں فرمایا کہ يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ یعنی وہ خشیت الٰہی سے نیچے گر پڑتے ہیں۔ مفہوم یہ ہے کہ جب کبھی پہاڑوں کی بلندی سے کچھ پتھر خود بخود نیچے لڑھکتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے جو قانونِ طبیعی مقرر کر دیا ہے اس کی تعمیل و اطاعت میں وہ اس قدر مستعد اور مطیع واقع ہوتے ہیں کہ جیسے اُن پر اللہ کی نافرمانی کے خوف سے رعشہ طاری ہوا اور وہ نیچے آگریں۔

پھر آگے چل کر پتھروں اور بنی اسرائیل کے دلوں کی سختی کا تقابل کرتے ہوئے فرمایا کہ پتھروں پر اُن کی سختی کے باوصف حرکت، تاثر، خستگی اور خود گدازی کی بعض کیفیات وارد ہو سکتی ہیں، مگر بنی اسرائیل کے دل ان کیفیات سے یکسر محروم ہیں۔ جو قوم اشرف المخلوقات تھی وہ اب اسفل السافلین کے مقام پر گر چکی ہے۔ اندازہ کیجیے کہ اس تقابل کے بعد سختی کا پلڑا بنی اسرائیل کے دلوں کی جانب کتنا جھک گیا ہے اور یہ تشبیہ اپنے معنوی تاثر کو کہاں سے کہاں لے گئی ہے!

دراصل بنی اسرائیل کے انقلابِ حال سے متعلق یہ قرآنی تشبیہ کسی مبالغہ آرائی یا شاعری پر

مبنی نہیں ہے بلکہ تمام تر صورتِ واقعہ یہی ہے۔ بنی اسرائیل صحرا نوردی کے دوران میں خود اپنی آنکھوں سے یہ مشاہدہ کر چکے تھے کہ کس طرح پتھر کی ایک چٹان سے پانی کے بارہ چشمے پھوٹے اور انہوں نے بچشم سر کوہِ طور کے ایک حصے کو تجلیٔ ربانی کے باعث ریزہ ریزہ ہوتے دیکھ لیا تھا۔ اس طرح جب قرآن نے بنی اسرائیل کے واقعات ہی کو تشبیہ کے انداز میں ان کے سامنے پیش کر دیا تو اُن کے لیے انکار و تمرّد کی گنجائش کہاں باقی رہی۔

اسی طرح قرآنِ حکیم نے یہ حقیقت بھی واضح کر دی کہ پتھروں میں ان کی سختی اور صلابت کے باوجود زندگی کا ایک لطیف احساس پایا جاتا ہے جو حرکت، تاثر اور تغیّر سے عبارت ہے اور جو کسی حال میں بھی ان سے منفک نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس بنی اسرائیل مُردہ ہو چکے اور ان میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہ رہی۔ اب اُن کے لیے کسی نبی کی ہدایت، کسی کتاب کی تعلیم اور کسی حکیم کی نصیحت کارگر اور مؤثر نہیں ہو سکتی۔ اب صُورِ اسرافیل کے سوا کوئی انہیں جگا نہیں سکتا۔

پتھر اپنے اندر سے پانی کے چشمے بہا سکتے ہیں، مگر بنی اسرائیل کے دلوں کے سوتے خشک ہو چکے تھے۔ پتھروں کی رگوں کے اندر سے حیات بخش پانی کے فوارے پھوٹ سکتے ہیں مگر بنی اسرائیل کے جسم کی شریانوں میں زہر بھر چکا تھا۔ اور ان میں رُوحانی زندگی کے کوئی آثار باقی نہ رہے۔ پتھروں میں اثر پذیری کی وہ صلاحیت پائی جاتی ہے جس سے ان میں ایک بے نام احساس موجود رہتا ہے۔ مگر بنی اسرائیل کی بے حسی پر ہَوا میں اُڑنے والے پرندے، پانی میں تیرنے والی مچھلیاں اور بلندی سے لڑھکنے والے پتھر بھی ماتم کُناں ہیں۔ وہ قوم ایسے مقام پر پہنچ چکی تھی کہ اس کا وجود اور عدم برابر ہو گیا تھا۔ اُس کی حیثیت گھاس کے ایک تنکے، ریت کے ایک ذرّے اور پانی کے ایک قطرے سے زیادہ نہ رہی تھی، کیونکہ گھاس کے تنکے بھی جمع ہو کر تعمیرِ آشیاں کر سکتے ہیں۔ ریت کے ذرّے جمع ہوں تو صحرائے اعظم بن سکتا ہے۔ اور پانی کے قطرے اکٹھے ہو کر بحر الکاہل کو موجزن بنا سکتے ہیں ـــ مگر بدبخت بنی اسرائیلیوں کی بھیڑ سوائے جہنم کا ایندھن بننے کے کسی کام نہیں آسکتی۔

بنی اسرائیل کے اس آئینے میں آج ہم اپنی تصویر بھی دیکھ سکتے ہیں!